باب۔۱۵

ترجمہ

فص عیسویہ

حکمت نبویہ

عن ماء مریم او عن نفخ جبرین   فی صورۃ البشر الموجود من طین

وہ، یعنی جناب عیسیٰ علیہ السلام آبِ مریم سے پیدا ہوئے یا نفخ اور پھونکنے سے جبرئیل کے، یا دونوں ہی سے جبرئیلؑ نفخِ روح کے وقت انسانِ خاکی کی صورت لیے ہوئے تھے

تکون الرّوح فی ذات مطھّرۃ   من الطّبیعۃ تدعوھا بسجّین

روحِ عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے جسم میں نمایاں و متعلق ہوئی جو قید خانہ طبیعت بشری کی کدورتوں سے پاک و مطہر ہے۔ ماں معتکفہ، یعنی اعتکاف اور چلہ بیٹھی ہوئیں، باپ کا تعلق ہی نہیں۔

لأجل ذالک قد طالت اقامتہٗ   فیھا فزاد علیٰ الف تبعیین

جبرئیلؑ روح الامین نفخِ روح کرنے والے ہیں، تو روحیت و نوریت کا غلبہ ہی ہو گا، اسی لیے تو اس جسم میں ہزار سال سے زیادہ زمانے تک حیاتِ عیسیٰؑ ممتد (یا طویل) ہوئی

{رفعِ عیسیٰؑ (یعنی عیسیٰؑ کے اٹھائے جانے) سے ولادتِ خاتم الانبیاؐ تک پانچ سو پچپن سال (اور) زمانہ کتابت فصوص الحکم تک چھے سو ستائیس ہجری، لہٰذا اس وقت تک حیاتِ عیسویؑ ہزار سے زائد ہو چکی تھی}

روح من اللہ لأ من غیرہٗ فلذا   احی الموات وانشأ الطّیر من طین

یہ روح بلا توسط باپ کے خود ذاتِ الٰہیہ سے تھی، لہٰذا روحانیتِ جناب عیسیٰ قوی تر تھی، یہی وجہ ہے کہ (وہ) مردوں کو بھی زندہ کرتے تھے اور مٹی سے پرندے بنا کر اڑاتے تھے

حتیٰ یصحّ لہٗ من ربہٖ نسب   بہٖ یؤ ثر فی العالی وفی الدّون

یہ ظاہر کرنے کے لیے ان کو رب العالمین سے نسبتِ خاص ہے، اس نسبتِ خاص سے انسان میں جو بلند پایہ اور اشرف المخلوقات ہے، اثر کرتے اور لا علاج بیماروں کو شفا دیتے، مردوں کو زندہ کرتے اور ادنیٰ مخلوقات مثلاً مٹی سے پرندے بنا کر ان میں پھونکتے اور وہ اُڑ جاتے

اللّٰہ طھّرہٗ جسما و نزّھہٗ روحًا و صیّرہ مثلًا بتکوین

اللہ تعالیٰ نے جناب عیسٰی علیہ السلام کے جسم کو پاک صاف کیا اور ان کی روح کو منزّہ و مبرّا کیا

پس وہ تصویر قدرتِ الٰہی ہیں، اُمّنا (ہم سب کی ماں) حوّا بغیر ماں کے تھیں تو عیسٰیؑ، بغیر باپ کے تھے

واضح ہو کہ روح کی یہ خاصیت ہے کہ جس شئے پر اس کا اثر ہو جاتا ہے تو وہ شئے زندہ ہو جاتی ہے۔ اور حیات اس میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سامری نے خاکِ نقش پائے جبرئیلؑ روح الامین کو لے کر سونے کے گوسالہ (یا بچھڑے) کے منہ میں ڈال دیا اور وہ گوسالہ لگا آواز دینے۔ سامری اس مسئلے سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ روح الامین ہیں۔ جہاں ان کا قدم پڑے گا، حیات سرایت کر جائے گی۔ تو اس نے قبضہ {یعنی مٹھی بھر} یا قبصہ {یعنی چٹکی بھر} مٹی لی اور (بچھڑے کی مورتی کی منہ میں ڈال دی) اور وہ گوسالہ لگا 'امبا امبا' کرنے۔ عربی میں گائے کی آواز کو خوار (کہتے ہیں)۔ اگر سامری گائے کے سوا کوئی اور صورت بناتا تو اس صورت کے لائق آواز کا ذکر ہوتا۔ جیسے، اُغاء {اونٹ کی آواز، اس کا بلبلانا}، ثواج {مینڈھے کی آواز}، یُعار {بکری کی آواز}، صوت، نطق، کلام {انسان کی آواز}۔

یہ واضح ہے کہ ہر شئے میں اس کے لائق حیات ہے، روح ہے۔ اسی روح و حیات کو جو کسی روح میں واقع ہے اس کا لاہوت اور اس جسم کو جس سے روح قائم ہے اس کا ناسوت، یعنی جسد کہتے ہیں

جب روح الامین جبرئیل علیہ السلام بی بی مریم کے سامنے پورے آدمی کی صورت میں متمثل و نمودار ہوئے تو بی بی مریم نے سمجھا کہ یہ ایک آدمی ہے جو ان سے جسمانی تعلق پیدا کرنا چاہتا ہے، فاستعاذت باللّٰہ منہ، (یعنی) لہٰذا پوری توجہ (اور) جمعیتِ خاطر سے اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کیا، پناہ مانگی، دہائی دی کہ ان کے شر سے خلاصی ملے۔ کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ غیر آدمی سے تعلق جسمانی جائز نہیں۔ پس ان کو اللہ تعالیٰ سے حضور تام ہوا۔ یہ حضور تام ایک روحِ معنوی و باطنی ہے۔

اگر اس وقت بی بی مریم کی ایسی غضب ناک حالت میں جبرئیلؑ نفخِ روح کرنا چاہتے تو اول تو بی بی مریم متاثر نہ ہوتیں، کیوں کہ پوری جمع ہمت سے اللہ تعالیٰ سے استعاذہ کر رہی تھیں۔ اگر جبرئیلؑ نفخِ روح کرتے بھی تو بی بی مریم کی غضب ناک حالت کی وجہ سے عیسٰی علیہ السلام ایسے تیز مزاج ہوتے کہ کوئی شخص ان کی صحبت میں ٹھیر نہیں سکتا (تھا)۔

جب جبرئیلؑ نے بی بی مریم سے کہا، "کوئی بات نہیں، میں تمھارے رب کا رسول ہوں، فرستادہ ہوں، آیا ہوں کہ تم کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں"۔۔۔ تو ان کے قبض و دل گرفتگی کی حالت جاتی رہی اور بسط و خوشی

کی حالت پیدا ہو گئی۔ (پھر) جبرئیلؑ نے بی بی مریمؑ میں اس حال میں نفخِ روح کیا جس طرح رسول، امّت کو کلام اللہ پہنچانے میں کیا کرتے ہیں۔ اسی طرح جبرئیلؑ نے کلمۃ اللہ (یعنی اللہ کے کلمہ "کُن") کو بی بی مریمؑ کو پہنچایا (اور) ان کی روح منتقل کر دی۔ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ، (یعنی) {عیسیٰؑ} کلمۃ اللہ ہیں جس کو {جبرئیلؑ نے} مریمؑ کی طرف ڈال دیا اور وہ روح (اللہ کی) بھیجی ہوئی ہے، (النساء:۱۷۱)۔

خواہشِ فرزند اور حُبِّ بقائے ذاتی، بی بی مریمؑ میں سرایت کر گئی اور جسم عیسیٰؑ، بی بی مریم کے حقیقی پانی اور جبرئیلؑ کے خیالی و وہمی پانی سے پیدا ہوا۔ نفخ میں ایک قسم کی رطوبت ہوتی ہی ہے کیوں کہ جسم کی نفخ اور پھونک میں اجزائے مائیہ ہوتے ہیں۔ بہر حال جسم عیسیٰؑ، ماء متوہم و خیالی اور ماے محقق دونوں سے پیدا ہوا۔ عیسیٰ علیہ السلام بشری صورت میں اس لیے نمودار ہوئے کہ ان کی ماں بشر تھیں اور جبرئیلؑ کا تمثل بھی صورتِ بشری تھا تاکہ خلق و تکوین نوعِ انسانی کی حسبِ عادت جاری ہو۔

پس عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے اور مردوں کو زندہ کرنے لگے۔ اس لیے کہ وہ روح اللہ تھے۔ احیا (یعنی زندہ کرنا) حقیقتاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھا، اور نفخ (یعنی روح کا پھونکا جانا) عیسیٰؑ کی طرف سے تھا۔ جیسے (بی بی مریمؑ میں) نفخ، جبرئیلؑ کی طرف سے، اور کلمہ یعنی کُن، اللہ کی طرف سے تھا۔

عیسیٰؑ کے احیاے اموات میں دو اعتبار ہیں۔ اس حیثیت سے کہ نفخ، عیسیٰؑ کی طرف سے تھا، جیسے وہ اپنی ماں سے حقیقتاً پیدا و ظاہر ہوئے ہیں، تو بظاہر احیا، عیسیٰؑ سے حقیقتاً ہے، اور اس حیثیت سے کہ احیاے حقیقی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ جناب عیسیٰ کی طرف نسبتِ احیا، مجاز و متوہم ہے۔ پس جیسے ان کی حقیقتِ ماء متوہم یعنی نفخ جبرئیل اور ماء حقیقی یعنی ماء مریم سے مرکب ہے ایسا ہی ان کے احیا میں بھی ایک اعتبار، حقیقی ہے اور ایک اعتبار، متوہم و مجازی (ہے)۔۔۔ لہٰذا جنابِ عیسیٰ کے حق میں کہا گیا، وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ، (یعنی) مردوں کو زندہ کرتے ہیں، (اٰل عمران:۴۹)۔ ظاہر کے لحاظ سے تحقیقاً، اور باطن کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے لیے تحقیقاً اور عیسیٰؑ کے لیے مجازاً (اور) بطور آلے کے توہماً۔

بیانِ معجزات عیسیٰؑ کے متعلق قرآن شریف میں ایک جگہ مقولۂ عیسیٰؑ اس طرح ہے، فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّـهِ، (یعنی) میں اس میں پھونکتا ہوں، نفخ کرتا ہوں، اور وہ ہو جاتا ہے پرندہ، اللہ کے حکم سے، (اٰل عمران:۴۹)۔ اور دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ ہے، وَإِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ بِإِذْنِي فَتَنفُخُ فِيهَا فَتَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِي وَتُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ بِإِذْنِي وَإِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِي، (یعنی) اور یاد کرو جب کہ تم بناتے ہو ایک جانور مٹی سے پرندے کی ہیئت کا میرے اذن و اجازت سے اور اچھا کر دیتے ہو مادر زاد اندھے اور کوڑی کو میرے

اذن سے،اور یاد کرو جب کہ تم مردوں کو قبروں سے نکالتے ہو{یعنی زندہ کرتے ہو}۔(المائدۃ:۱۱۰)۔۔۔ (اب) پہلی آیت فَأَنفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّـهِ پر غور کرو۔ بِإِذْنِ اللَّـهِ اگر انفخ سے متعلق ہو تو معنیٰ یہ ہوں گے، میں اللہ کے حکم سے نفخِ روح کرتا ہوں ایک جسدِ خاکی میں اور وہ پرندہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر فَيَكُونُ سے بِإِذْنِ اللَّـهِ متعلق ہو تو معنیٰ یہ ہوں گے ، میں ایک جسم خاکی میں پھونکتا ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جاتا ہے۔ جب بِإِذْنِ اللَّـهِ، نفُخُ ہو تو نفخ کرنے والا، اِذن اور اجازت یافتہ ہو گا اور پرندے کا وجود ظاہر کے لحاظ سے نافخ یعنی نفخ کرنے والے کی طرف منسوب ہو گا۔ اگر بِإِذْنِ اللَّـهِ، یکون سے متعلق ہو تو نافخ نے نفخ کیا اور اللہ تعالیٰ کے اذن سے پرندہ موجود ہو گیا۔ گویا موجود ہونا پرندے کا کام ہوا، نافخ کی طرف اس کا وجود منسوب نہ ہو گا۔

عیسیٰؑ کی خلقت و پیدائش میں دو اعتبار تھے۔(۱) مادے متوہم یعنی نفخ جبرئیلؑ اور (۲) مادے حقیقی مریمؑ، لہٰذا ان کے تمام افعال و معجزات میں دو اعتبار ہیں۔ ایک باعتبار جسم خاکی کے اور ایک باعتبار روحانیت کے۔

عیسیٰؑ میں تواضع و نرمی اتنی تھی کہ اپنی امّت کو حکم دیا تھا کہ اپنے ہاتھ سے ذلت کے ساتھ جزیہ دیں۔ اگر کسی نے ایک رخسار پر طمانچہ مارا تو اس کے سامنے دوسرا رخسار بھی پیش کر دیں۔ تفاخر و خود پسندی نہ کریں۔ اور ظالم سے تصادم اور بدلہ نہ چاہیں۔۔۔ یہ تواضع و نرمی باپ کے نہ ہونے اور صرف ماں کے ہونے کی وجہ سے ہے۔ کیوں کہ مرد کے مقابل عورت کو پستی ہے، شرعاً اور حساً، دونوں طور سے۔

مردوں کو زندہ کرنا، بیماروں کو اچھا کرنا، جبرئیلؑ کے صورتِ بشری لے کر نفخ کرنے کا اثر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسیٰؑ صورتِ بشری ہی رکھ کر احیاے موتیٰ کرتے تھے۔ اگر جبرئیلؑ صورتِ بشری نہ لیتے بلکہ موجوداتِ عنصری میں سے کسی اور صورت کو لیتے، جیسے حیوان، نبات (اور) جماد، تو عیسیٰؑ مردے کو اس وقت تک زندہ نہ کرتے، احیاے موتیٰ نہ کرتے جب تک (کہ) اُس صورتِ جبرئیل کو اختیار نہ کر لیتے۔

اگر جبرئیلؑ صورتِ نوری لیتے جو عناصر و ارکان سے سوا ہے {یہ یاد رکھو کہ ایک شئے لاکھ تنزل کرے مگر اپنی فطرت و طبیعت سے نہیں نکلتی۔ نوری جبرئیلؑ نوری ہی رہیں گے، گو کہ آدمی کی صورت (لے) لیں}، تو عیسیٰؑ بھی جب تک نوری صورت نہ لیتے اور عنصری صورت نہ چھوڑتے اور ماں کی طرف کی بشری صورت بھی نہ رکھتے تو احیاے موتیٰ نہ کرتے۔ غرض یہ کہ صورتِ جبریلیؑ اور مادری دونوں سے مناسبت ضروری ہے۔ جب لوگ عیسیٰؑ کو احیاے موتیٰ کے وقت دیکھتے تو کہتے کہ عیسیٰؑ وہی ہیں، نہیں وہ نہیں ہیں۔ جیسے ایک عاقل شخص غور و فکر کرتا اور آدمیوں میں سے ایک کو احیاے موتیٰ کرتا دیکھتا ہے، جو خصائص الٰہیہ اور صفات الٰہیہ سے ہے۔ پھر صرف زندہ ہوتا ہی نہیں بلکہ بات چیت بھی کرتا ہے تو حیران رہتا ہے۔ کیوں کہ وہ انسانی صورت میں خدائی صفات و آثار پاتا ہے۔

بعض نادان جناب عیسیٰؑ میں حق تعالیٰ کا حلول جاننے لگے اور کہنے لگے (کہ) یہ عیسیٰؑ ہی اللہ ہیں، اس وجہ سے کہ مردوں کو زندہ کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ کافر سمجھے گئے۔ کفر کے معنیٰ ہیں ستر، ڈھانپنا۔ چوں کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کو جو حقیقتاً احیاے موتیٰ کرنے والا ہے، عیسیٰؑ کی صورتِ بشری میں چھپادیا۔ صورتِ عیسیٰؑ ان کی آنکھوں کے سامنے پردہ ہوگئی اور ان کی رسائی جنابِ حق (یعنی اللہ تعالیٰ) تک نہ ہوئی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّـهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ (یعنی) بے شک کفر کیا ان لوگوں نے جنھوں نے کہا، اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے، (المائدۃ:۱۷ اور ۷۲ میں بھی)۔ انھوں نے نہ صرف هُوَ الْمَسِيحُ یا ابْنُ مَرْيَمَ کہا بلکہ دونوں کو ملالیا، اور احیاے موتیٰ کو تجلی و پرتو صفات الٰہیہ کی طرف منسوب کرنے کے عوض صورتِ ناسوتیہ، بشریہ جناب عیسیٰؑ کی نسبت دے دی۔ انھوں نے ابن مریم کہا۔ بے شک عیسیٰؑ، ابن مریم ہیں مگر سامع نے خیال کیا کہ نسبتِ الوہیت صورتِ عیسوی کی طرف کی گئی۔ مگر غالباً انھوں نے ایسا نہیں کیا ہوگا بلکہ مذہبِ حلول کی وجہ سے انھوں نے ہویت ذاتِ الٰہی کو ابتدا ہی سے صورتِ بشری عیسوی میں، جو ابن مریم ہے، حال (یعنی اصل) سمجھا۔ حال و محل دونوں جدا جدا ہوتے ہیں، لہٰذا انھوں نے صورتِ عیسوی اور ذاتِ الٰہی میں فرق بھی کیا۔ اس فرق کے باوجود صورتِ عیسوی اور ہویت ذاتِ الٰہی کو عین اور ایک ہی سمجھا۔ اس لیے انھوں نے کہا ﴿إِنَّ اللَّـهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾

دیکھو! جبرئیلؑ صورتِ بشری میں متمثل (یا ظاہر ہوئے) تھے۔ بی بی مریمؑ سے گفتگو کرنے کے بعد آپ نے نفخ کیا، تو یہ نفخ بعد کی چیز ہے۔ لہٰذا نفخ حادث ہے (نو پیدا ہے)۔ پس صورت بشری جبریلی اور نفخ دونوں میں فرق ہوا۔ دونوں ایک نہ ہوئے۔ چوں کہ ذاتیات ذات سے کبھی منفک و جدا نہیں ہوتے لہٰذا نفخ اس صورتِ جبریلی کی ذاتیات سے نہ تھا۔ یہی حال الوہیت اور "صورتِ جسمانی و بشری" اور "(صورتِ) ناسوتی عیسوی" کا ہے کہ دونوں ایک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے متعلق اہل مذاہب کا اختلاف ہوا۔ کوئی ان کی صورتِ انسانی بشری پر نظر ڈالتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ ابن مریمؑ ہیں۔ کوئی ان کی صورتِ متمثلۂ جبرئیلؑ کی شبیہ دیکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مسیحؑ، روح القدس سے ہیں یا خود روح القدس یعنی جبرئیلؑ ہیں۔ کوئی ان کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ احیاے موتیٰ کرتے ہیں تو (وہ) روحیت میں ان کو منسوب الی اللہ کرتا ہے اور ان کو روح اللہ کہتا ہے۔ اور خیال کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ہی سے حیات پیدا ہوئی، جس میں آپ نفخ فرماتے ہیں۔

بہر حال حضرت عیسیٰ کو دیکھ کر کبھی حق تعالیٰ کا وہم ہوتا ہے، کبھی جبرئیل روح القدس کا وہم ہوتا ہے (اور) کبھی انسان و بشر ہونے کا خیال ہوتا ہے۔ ہر دیکھنے والا اپنی نظر خاص اور حالِ خاص سے دیکھتا ہے جو اس پر غالب ہے۔ ہمارے پاس تو (وہ) کلمۃ اللہ بھی ہیں، روح اللہ بھی ہیں، عبداللہ بھی ہیں (مگر) باہم کچھ تضاد نہیں۔ اس لیے کہ اعتبارات جدا جدا نہیں۔

عیسیٰؑ کے سوا کسی اور کی صورتِ حسی و جسمانی میں ایسا اختلاف نہیں، کیوں کہ آدم و بنی آدم میں پہلے تسویۂ جسم (یعنی جسم درست) ہوا، اور ہوتا ہے۔ (اولاً) جسم کی استعداد و قابلیت مکمل کی جاتی ہے۔ پھر اس میں نفخِ روح کی جاتی ہے۔ عیسیٰؑ کا تسویۂ جسم اور نفخِ روح دونوں معاً (یعنی) ایک ساتھ ہیں۔ دوسرے بنی آدم، اپنے پدر صوری و ظاہری (یا والد) کی طرف منسوب ہوتے ہیں، نہ یہ کہ نافخِ روح یعنی روح پھونکنے والے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ دیکھو! عام طور سے اللہ تعالیٰ جب جسم انسانی کو حالتِ اعتدال پر لاتا ہے، مکمل استعداد عطا کرتا ہے (اور) تسویۂ جسد فرماتا ہے، جیسا کہ (وہ) فرماتا ہے، فاذا سوّیتہٗ،(یعنی) جب میں اس کے جسم کا تسویہ کرتا ہوں، وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي،(یعنی) تو اس میں اپنی روح کا نفخ کرتا ہوں، (الحجر:۲۹ اور ص:۷۲)۔۔۔ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے اپنی روح کی طرف اس کے وجود و ذات کو منسوب فرمایا۔ (لیکن) عیسیٰؑ کی حالت ایسی نہیں۔ ان کے نفخِ روح میں تسویۂ جسم و صورت بشری داخل ہیں۔ ادھر روح پھونکی گئی اور ادھر سب کچھ ہو گیا۔ دوسرے بنی آدم کی حالت ایسی نہیں جس طرح کہ ہم نے بیان کیا ہے۔ تمام موجودات، کلمات اللہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتے۔ کیوں کہ وہ کُن سے ہیں۔ اور کُن، کلمۃ اللہ ہی تو ہے۔ اس قول کُن کی دو نسبتیں ہیں۔ اول، حقیقت الحقائق و ذاتِ الٰہیہ اور ماہیتِ حقہ کی طرف۔ اس لحاظ سے وہ نسبت، ناقابل ادراک رہے گی۔ دوم، کُن کو صورتِ مقیدہ اور اس کی صورت کی طرف نسبت کریں جس میں وجودِ مطلق کا تنزل اور اس کا تعین ہوا ہے، ظہور ہوا ہے۔

بعض عارفین کُن کا مخاطب ذاتِ حق کو سمجھتے ہیں، اور بعض حقیقتِ ممکنہ یعنی اس کے عین ثابتہ کو۔ اور بعض حیران رہ جاتے ہیں۔ نہ اِدھر نسبت کرتے ہیں نہ اُدھر۔ یہ مسئلہ بجز ذوق و وجدان کے، عقل سے ادراک نہیں ہو سکتا۔ جیسے ابو یزید بسطامیؒ کہ ایک دفعہ ان کے ہاتھ سے ایک چیونٹی مر گئی۔ انھوں نے اس کے تنِ بے جان میں پھونکا۔ وہ چیونٹی باذن اللہ زندہ ہو گئی۔ اس وقت بایزیدؒ کو معلوم ہوا کہ کون نفخ کر رہا ہے۔ کون روح پھونک رہا ہے۔ بہر حال بایزیدؒ نے نفخ کیا اور اس نفخ میں وہ عیسیٰؑ کے شہود والے اور ان کے زیر قدم تھے، پر تو عیسوی ان پر پڑا تھا۔

احیاے باطنی و معنوی علم ہوتا ہے۔ علمی حیات کیسی ہے۔۔؟ حیات الٰہیٰ ہے، ذاتی ہے (اور) حیاتِ نوری ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ،(یعنی) کیا یہ نہیں ہے کہ ہم نے مردہ دل کو زندہ کر دیا اور ہم نے اس کو نور عطا کیا جس کو لے کر لوگوں میں چلتا ہے، (الانعام:۱۲۲)۔ لہٰذا جس نے کسی مردہ دل کو حیاتِ علمی سے کسی خاص مسئلے میں جو علم و عرفان الٰہی سے متعلق ہے زندہ کر دیا، بے شک اس استاد نے شاگرد کو زندہ کر دیا اور یہ اس معرفت کو لے کر وہ اپنے ہم شکل و ہم صورت لوگوں میں چلتا ہے۔

فلولاہ ولولانا لما کان الذی کانا

اللہ تعالیٰ نہ ہوتا اور ہم اور ہمارے اعیان و حقائق نہ ہوتے تو جو کچھ موجود ہے ہر گز موجود نہ ہوتا

فانّا اعبد حقا وانّ اللہ مولانا

ہم بے شک بندے ہیں اور اللہ ہمارا مولیٰ ہے، آقا ہے

وانّا عینہٗ فاعلم اذا ما قلت انسانا

ہم منشا اور اصل حقیقت کے لحاظ سے اللہ سے جدا نہیں ہیں، خوب سمجھو، اگر تم انسان کو خلیفۃ اللہ مانتے ہو اور اس کو مظہر اسما و صفات سمجھتے ہو، اللہ کے وجود کو بالذات اور انسان کے وجود کو بالعرض سمجھتے ہو۔

فلا تحجب بانسان فقد اعطاک برھانا

پس اے عارف یہ صورتِ ظاہر ہی انسان کی حجابِ چشم بصیرت نہ ہو اور مانع دیدار کمالاتِ الٰہی نہ ہو کیوں کہ برہان سے ثابت ہے کہ بالعرض بغیر بالذات کے رہ نہیں سکتا

فکن حقا وکن خلقا تکن باللہ رحمانا

تم میں سے کچھ حق تعالیٰ کے صفات کا ظہور ہو، کچھ بندگی کا اعتراف ہو، تو تم جہتِ الٰہی سے تخلق باخلاقِ الٰہی کی وجہ سے خلق پر رحم کروگے

و غذّ خلقہٗ منہ تکن روحا وریحانا

خلق خدا کو عرفانِ الٰہی کی غذا دیا کرو، تو تم سراپا راحت و خوشبو ہو جاؤ گے

فاعطیناہ ما یبدو بہٖ فینا و اعطانا

ہم نے اللہ تعالیٰ کو اس کا مظہر دیا جس سے اس کے کمالات ظاہر ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو وجود بخشا اپنے کمالات کو پرتو ہم پر ڈالا

فصار الامر مقسوما بایاہ و ایّانا

یہ جگ دھندا بٹا ہوا ہے، ہم میں اور اللہ میں

فاحیاہ الذی یدری بقلبی حین احیانا

جو میرا حالِ دل جانتا ہے یعنی اللہ نے مجھے حیاتِ ظاہری دی تو حیاتِ علمی بھی دی اور عرفان سے سرفراز فرمایا

فکنّا فیہ اکوانا واعیانا وازمانا

ہم علم الٰہی میں اعیان ثابتہ تھے اور عالم ارواح میں اکوان و مخلوق تھے، اور عالم شہادت ناسوت و جسم میں جو تحتِ زمانہ ہے مشہود و مرئی (ہیں)، غرض کہ ہم علم الٰہی میں سرمدی، ارواح میں دَہری (اور) اجسام میں زمانی تھے مگر حال میں اسی میں تھے، اس سے کبھی جدا نہیں ہوئے

ولیس بدائم فینا ولٰکن ذاک احیانا

مگر یہ حضور، یہ شہود، دائمی کب رہتا ہے، کبھی کبھی رہتا ہے اور کبھی غفلت بھی رہتی ہے

نفخِ روحانی اور صورتِ بشری عنصری کے متعلق ہم نے جو کچھ ذکر کیا ہے اس پر واقعات و مسائلِ ذیل بھی دلالت کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اپنی صفت نفسِ رحمانی بیان کی ہے اور یہ ظاہر ہے کہ موصوف کو صفت عارض ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے لوازم و توابع بھی لگے ہوئے رہتے ہیں۔ یہ بھی تم کو معلوم ہے کہ ہر متنفس کے نفس اور سانس کو کیا لازم ہے۔ اسی لیے نفس الٰہی رحمانی نے صورِ عالم کو قبول کیا۔ نفسِ رحمانی تمام عالم کا جوہر ہیولیٰ ہے۔ عالم کی یہ رنگا رنگی سب نفسِ رحمانی میں نمایاں ہے۔ یہی نفسِ رحمانی عالم کی طبیعت کلّی ہے۔ اس طبیعت کی صورتیں ہیں۔ جو کچھ چیزیں پیدا ہوئی ہیں عناصر بھی اس طبیعت کے صور ہیں۔ عناصر سے اوپر جو کچھ ہے وہ بھی اس کی صورتیں ہیں۔ عناصر سے جو چیزیں پیدا ہو رہی ہیں وہ بھی اسی طبیعت کلّی، اسی نفسِ رحمانی (اور) اسی فیضِ یزدانی کے جلوے اور اس کی نمائشیں و صورتیں ہیں۔ مافوق العناصر کیا ہے۔۔؟ ارواح علویہ ہیں جو ہفت آسمان و سبع سماوات سے اوپر اوپر اور مافوق ہیں۔

ارواح سبع سماوات اور خود سماوات سب عنصری ہیں، جو دخانِ عناصر (یا کیمائی اجزاو مرکبات) سے متولد و پیدا ہوئے ہیں۔ ہر آسمان میں جو ملائکہ و فرشتے ہیں وہ ان ہی سماوات و آسمان کی جنس سے ہیں اور عنصری ہیں۔ ملائکہ سماوات سے اوپر ملائکہ طبعی ہیں جن کو 'ملأ الاعلیٰ' بھی کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ ملأالاعلیٰ کی صفت، اللہ تعالیٰ نے اختصام و اختلاف (یعنی معاندانہ) بتائی۔ حدیث (ہے کہ) فیم یختصم الملأ الاعلیٰ (یعنی) یہ ملأالاعلیٰ والے کس امر میں اختلاف اور جھگڑا کر رہے ہیں، (سنن الترمذي، مسند احمد، سنن الدارمی)۔ ملأالاعلیٰ والوں کے طبعی ہونے ہی کی وجہ سے باہم اختلاف ہوا، کیوں کہ طبائع متقابل ہیں۔ ان میں تضاد ہے۔ اسمائے الٰہیہ میں بھی تقابل ہے مگر وہ اعتبارات و نسب ہیں۔ کوئی خارجی و حقیقی و مختلف الذوات اشیا نہیں ہیں۔ یہ تضاد و اختلاف نفس رحمانی ہی میں، یا اس کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ دیکھو! ذاتِ مقدسہ الٰہیہ جو تضاد سے منزّہ و مبرّا (اور پاک) ہے، اس کی صفت ہے، إِنَّ اللَّـهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ، (یعنی) اللہ تمام عالموں سے غنی و بے نیاز ہے (العنکبوت:۶)۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اپنے موجد، اپنے پیدا کرنے والوں کی صورت اور رنگ پر ہے۔ اس کا موجد کون ہے۔۔؟ نفس الٰہی رحمانی ہے۔

سانس میں حرارت (یا گرمی)، برودت (یا ٹھنڈک)، رطوبت (یا نمی)، یبوست (یا خشکی) سب کیفیات رہتے ہیں، جس میں حرارت کا غلبہ ہوتا ہے وہ اوپر جاتا ہے، اور لطیف رہتا ہے۔ جس میں برودت و رطوبت ہوتی ہے وہ اسفل میں (یعنی نیچے) رہتا ہے۔ جس میں یبوست ہوتی ہے وہ بیٹھ جاتا ہے۔ رسوب اور تہ نشین، باردو رطب (ٹھنڈا اور نم) ہوتا ہے۔

دیکھو! جب طبیب کسی بیمار کو دوا پلانا چاہتا ہے تو اس کے پیشاب کا قارورہ یعنی شیشی کو دیکھتا ہے۔ جب قارورے میں رسوب دیکھتا ہے تو جانتا ہے کہ مواد پک گیا ہے۔ پھر بیمار کو دوا پلاتا ہے کہ جلد کامیابی ہو۔ رسوب اس لیے پیدا ہوتے ہیں کہ طبیعت میں رطوبت و برودت رہتی ہے۔ پھر یہ واضح رہے (کہ) شخص انسانی طینت کو اللہ تعالیٰ (نے) اپنے دونوں دستِ قدرت سے گوندھا (ہے)، اور وہ صفات متقابلہ ہیں۔ ہر چند کہ اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھ سیدھے ہی ہیں، یعنی کم تر و ضعیف نہیں، مگر ان میں فرق ظاہر (ہے)، غیر مخفی ہے۔ اگرچہ کہ ان میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ وہ دو ہیں یعنی دو ہاتھ ہیں، صفات متقابلہ ہیں۔ کیوں کہ طبیعت میں وہی تاثیر کرتا ہے جو مناسب ہوتا ہے۔ طبائع تو آپس میں متقابل اور متضاد ہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے طینتِ بشری میں 'یدین' کا لفظ لایا ہے۔ اس لیے کہ انسان جامع اضداد ہے۔ اس میں وہ سب ہے جو تمام عالم میں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو خود اپنے صفاتِ متقابلہ سے پیدا کیا تو اس کا نام بشر رکھا، کیوں کہ اس کے دونوں دستِ قدرت نے انسان کے خلق میں مباشرت کی ہے یعنی خود کام کیا ہے۔ یہ نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کی عنایتِ خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جس نے آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا فرمایا، مَا مَنَعَكَ أَن تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ أَسْتَكْبَرْتَ أَمْ كُنتَ مِنَ الْعَالِينَ، (یعنی) تجھے کس چیز نے منع کیا کہ آدم کو سجدہ کرے، جس کو میں نے اپنے دونوں دستِ قدرت سے بنایا۔ کیا تو نے تکبر کیا، یا تو اپنے کو بڑوں اور بلند مرتبہ لوگوں میں سے سمجھتا ہے، (ص:۷۵)۔ حالاں کہ تو ایسا نہیں۔ شیخؒ کہتے ہیں (کہ) کیا تو خود (کو) اپنے جیسے عنصری سے افضل سمجھتا ہے، یا عنصریت و مادیت سے پاک ملائکہ کرّوبین، مہیمین، اہل ملأ الاعلیٰ (میں) سے جانتا ہے۔ عالین سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو نشأت و خلقتِ نوری رکھتے ہیں۔ اگرچہ طبعی ہیں، مگر عنصریت سے پاک ہیں، منزّہ ہیں۔

انسان کو دیگر انواعِ عنصری پر جن کی تخلیق میں دو دستِ قدرت و صفات متضادہ شامل نہیں، اس لیے فضلیت ہے کہ وہ مٹی کا ہے۔ لہٰذا انسان ملائکہ ارضی و سماوی سے اعلیٰ و افضل ہے۔ اور ملائکہ ملأ الاعلیٰ و کرّوبی اس نوعِ انسانی سے افضل ہیں۔ کیوں کہ نصِّ الٰہی یعنی (قرآن میں) أَمْ كُنتَ مِنَ الْعَالِينَ (ص:۷۵) وارد ہوا ہے۔۔۔ اور حدیث میں آیا ہے، من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہٗ فی نفسی ومن ذکرنی فی ملأ ذکرتہٗ فی ملأ خیر منھم، {یعنی} جس نے مجھے اپنے دل میں یاد کیا میں نے بھی اس کو اپنے جی میں یاد کیا، اور جس نے مجھ کو ہم نشینوں میں یاد کیا میں نے بھی اس کو ایسے ہم نشینوں میں یاد کیا جو اس کے ہم نشینوں سے اعلیٰ ہیں (حدیث قدسی، حصن المسلم، صحیح البخاری)۔ تمام علما کی رائے ہے کہ چوں کہ (قرآن میں) فَسَجَدَ الْمَلَائِكَةُ كُلُّهُمْ أَجْمَعُونَ، (یعنی) فرشتوں نے سب کے سب مل کر سجدہ کیا (آدم کی بزرگی کو مان لیا)، (الحجر:۳۰ اور ص:۷۳)، اور]۔

انا من نوراللّٰہ وکلھم من نوری،[(یعنی)میں اللہ کے نور سے ہوں اور سب میرے نور سے ہیں،(حدیث۔کتب الصوفیہ)میں] آیا ہے۔ لہٰذا انسان اشرف المخلوقات اور مظہر اتم اور خلیفۃ اللہ ہے۔ مگر شیخ(ابن عربیؒ)ملائکہ ملأالاعلیٰ کی طرف صرف جانبِ نوریت(یعنی نوری ہونے) کو اور انسان کی جانبِ ارضیت(یعنی خاکی ہونے) کو دیکھ کر ملائکہ ملأالاعلیٰ کو افضلیت دیتے ہیں۔ اور شیخؒ کی نظر انسان کی جامعیت پر اس وقت نہیں ہے، لہٰذا شیخؒ کہتے ہیں کہ وہ مامور سجدہ نہیں تھے۔ مامور سجدہ کیا ہوتے جب کہ حقیقتِ انسانیہ کے سامنے سجدے ہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

کیاملک میری حقیقت کو سمجھتے علوی

ان کا استاد نہ سمجھا وہ معما ہوں میں (علویؔ)

اصل راز یہ ہے کہ انسان کے سوائے کسی پر فنائیت نہیں آتی۔ ہر ایک اپنے مرکز پر اڑا ہوا ہے۔ جس کو نفس الٰہی کی معرفت حاصل کرنی ہو وہ عالم کی معرفت حاصل کرے۔ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَـٰذَا بَاطِلًا،[(یعنی)جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور و فکر کرتے ہیں(وہ کہہ اٹھتے ہیں) اے ہمارے پروردگار تو نے ان کو باطل نہیں پیدا کیا،(اٰل عمران:۱۹۱)]۔سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ، (یعنی)ہم ان کو اپنی تجلیات و علامات، آفاق عالم اور ان کے انفس میں دکھائیں گے،(فصلت:۵۳)۔(اور) من عرف نفسہٗ فقد عرف ربّہٗ،(یعنی) جس نے اپنی معرفت حاصل کی اس نے اپنے رب کی معرفت حاصل کر لی(حدیث۔کتب الصوفیہ)۔۔۔ جس میں اس کا ظہور ہے یعنی عالم نفس رحمانی میں ظاہر ہوا، اور اسمائے الٰہیہ جو اپنے ظہور اور مظاہر کی طلب میں بے قرار تھے اس بے قراری کو دور کر دیا۔ اس نے اپنے آپ میں مظاہر کو پیدا کر کے خود اپنے پر احسان کیا۔ گویا ان ظہورات کا فائدہ و اثر خود اس جنابِ مقدس پر پڑتا ہے۔ پھر بے قراریاں و اضطراب آخر مخلوق کی پیدائش تک رہیں اور دور بھی ہوتی رہیں۔

فالکلّ فی عین النّفس کالضّوء فی ذات الغلس

یہ ساری رنگا رنگیاں نفس رحمانی ہی میں ہیں، جیسی اندھیری رات میں روشنی

والعلم بالبرھان فی سلخ النھار لمن نعس

معرفت و شہود تو مثل روزِ روشن کے ہے، اور براہینِ عقلیہ سے حاصل شدہ علم

ختم روز کی غنودگی والا اور اونگھتا ہوا آدمی کے خواب و خیال کے مانند ہے جو وہ دیکھتا ہے

فیری الذی قد قلتہٗ رؤیا تدلّ علی النفس

یہ غنود آگیں، اونگھنے والا، محجوب، غافل جو کچھ ہم نے بیان کیا اس کو خواب و خیال

غیر معتبر ناقابل اعتماد سمجھتا ہے، جو چند سانسوں پر قائم رہتا ہے۔

فیریحہٗ عن کل غم م فی تلاوتہٖ عبس

جو شخص عَبَسَ وَتَوَلّٰی پڑھتا تھا، یعنی ترش رو اور پہلو تہی کرتا تھا، ہم نے جو کچھ کہا اس کو سمجھ لیا

تو اس کا سارا غم غلط ہو گیا اور ہر طرح کا آرام مل گیا

ولقد تجلیٰ للّذی قدجاء فی طلب القبس

دیکھو موسیٰؑ تو آگ لینے نکلے تھے اور خدائے تعالیٰ کی ان کے سامنے تجلی ہو گئی

فراہ نارًا وھو نو رٌ فی الملوک فی العس

ابتداءً موسیٰؑ نے تجلی کو آگ سمجھا، حالاں کہ بالآخر حضرت موسیٰؑ و دیگر سلاطین ولایت کے پاس وہ نور تھا

وہ نور ہی تھا متوسطین کے پاس بھی جو راتوں کو گشت کرتے ہیں اور ظلمت میں پھرتے رہتے ہیں

فاذا فہمّت مقالتی تعلم بانّک مبتئس

اگر تم میری بات سمجھ جاؤ تو تم کو معلوم ہو گا، سب کچھ خدا کا ہے، اور تم مفلس و نادار ہو

لو کان یطلب غیر ذا لرأٰہ فیہ وما نکس

اگر اس صورت پیش افتادہ اور حاضر الوقت کے سوا کسی اور صورت کو طلب کرتے

تو اس میں سے بھی جلوۂ کمالات محبوب نظر آ ہی جاتا، کبھی سرنگوں و نادم و ناکامیاب نہ ہوتے

کلمۂ عیسوی یعنی ذاتِ حضرت عیسیٰؑ کے لیے حق تعالیٰ مقام حتّٰی نعلم و یعلم میں قائم ہوا، یعنی تمام عالم پر حقیقت واقعہ واضح و ثابت کرنا چاہا۔ ہر چند اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اور ہر چیز کو جان کر ہی پیدا کرتا ہے، مگر دنیا کو اصل حال معلوم ہو جانے کے لیے فرماتا ہے (کہ) ہم کو بھی معلوم ہو جائے۔ غرض یہ کہ حق تعالیٰ نے جناب عیسیٰؑ سے استفہام کیا، پوچھا، اس واقعے کو جو ان کی طرف منسوب ہے کہ کیا وہ حق ہے یا جھوٹ۔ اُس کو (یعنی اللہ تعالیٰ کو) علم قدیم ازلی فعلی سے تو معلوم تھا ہی، مگر اس کے ساتھ ایک اور طرح کا علم بھی ملا لینا چاہتا ہے کہ وہ جو جانتا تھا واقع ہوا یا نہیں۔

پس حق تعالیٰ نے عیسیٰؑ کو فرمایا، أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَـٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّـهِ، (یعنی) کیا تم نے لوگوں سے کہا مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوائے دو معبود بنالو، (المائدۃ:۱۱۶)۔ پوچھنے والے یعنی اللہ کے جواب میں عیسیٰؑ کو ادب ضرور ہے، کیوں کہ جب حق تعالیٰ نے اس مقام اور اس صورت میں تجلی فرمائی تو حکمت کا اقتضا تھا کہ جواب میں تفرقہ و تعیین اور جمع و احدیت دونوں کا لحاظ رکھا جائے۔

(اوپر بیان کردہ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۶ میں آگے آتا ہے کہ) عیسیٰؑ نے پہلے تنزیہ کو رکھا اور عرض کیا، سُبْحَانَكَ، (یعنی) تو پاک ہے۔ "سبحان" سے تنزیہ اور "کافِ خطاب" سے ایک قسم کی تحدید و تعیین

نکلتی ہے۔ کیوں کہ کاف مواجہ اور خطاب کا مقتضی ہے ،مَا يَكُونُ لِي ،(یعنی)میری کیا مقدور ہے، کیا طاقت ہے۔ میرے لیے تو عبدیت ہے، تیرے لیے حکم ہے۔ امر ہے۔ تو جو چاہے کہہ سکتا ہے۔ مجھے ایسی جرأت کیوں کر ہو سکتی ہے۔أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ، (یعنی) کہ میں ایسی بات کہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ میری ہویت، میری ذات کا تقاضا ہر گز نہیں کہ الوہیت کا دعویٰ کر بیٹھوں۔إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ،(یعنی)اگر میں نے کہا ہے تو تُو خوب جانتا ہے۔ اصل میں کہنے والا تُو ہی تو ہے۔ ہمارے تکلم میں بھی تیرے کلام کا جلوہ ہے اور جو کوئی بات کرتا ہے، تُو اس کو خوب جانتا ہے۔

تُو ہی میری زبان ہے، جس سے میں بولتا ہوں، کلام کرتا ہوں۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث قدسی میں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صاحب قرب ونوافل کی میں زبان ہو جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔۔۔ دیکھو! اس حدیث میں ذاتِ حق کو متکلم کی زبان بیان کیا گیا، مگر کلام کو عبد کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

(سورۃ المائدۃ کی اسی آیت ۱۱۶ میں آگے ہے کہ) پھر اس بندۂ نیک نے یعنی عیسیٰؑ نے اس قول سے اپنے جواب کی تکمیل کی (انہوں نے فرمایا)،تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ،(یعنی)میرے دل میں جو ہے، تُو اس کو خوب جانتا ہے،اور تیری ذات ونفس میں جو ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ دیکھو! عیسیٰؑ نے اپنی ذات من حیث الذات سے علم کی نفی کی، کہ علم ان کی ذات سے پیدا نہیں۔ نہ اس لحاظ سے کہ وہ متکلم ہیں اور کلام الٰہی کا ان پر پرتو پڑا ہے اور اثر ہوا ہے۔إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ،(یعنی)تو ہی غیب داں ہے، تو ہی ڈھکی چھپی چیزوں کو خوب جاننے والا ہے۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ کے غیب داں ہونے کے لیے جناب عیسیٰؑ نے ضمیر فصل وعماد یعنی " أَنتَ "کا استعمال کیا تا کہ بیان میں زور اور تاکید ہو، اور اسی پر پورا اعتماد ہو، اور حصر (یا اُسی پر پورا انحصار) بھی پیدا ہو۔ کیوں کہ اللہ کے سوا کوئی بذاتہٖ غیب داں نہیں۔ وہ جو کچھ بتانا چاہے، بتادے۔ جناب عیسیٰؑ نے عبد ورب، خلق وخالق تنزیہ و تشبیہ میں فرق اور امتیاز بھی کیا، اور وجود کے لحاظ سے جمع بھی کیا کیوں کہ وجود تو عین ذاتِ حق ہے۔ وحدت ذاتِ حقہ اور کثرتِ مظاہر کو بھی بتایا۔ وجودِ مطلق کے لحاظ سے وسعت (بھی) دکھائی اور تعیین ومخاطبت کے لحاظ سے تنگی بھی ظاہر کر دی۔ پھر اتمام جواب اس قول سے کیا،مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ،(یعنی)میں نے صرف وہی کہا ہے جس کا تُو نے مجھے حکم دیا تھا،(المائدۃ:۱۱۷)۔ دیکھو! پہلے تو انھوں نے اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ وہ ہیں ہی نہیں۔ نہ وہ قابل کلام و قول ہیں۔ پھر سوال کرنے والے یعنی حق تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھ کر قول کو اپنی طرف منسوب کیا۔ اگر یہ بالعرض علم و قول نہ رہتا تو جنابِ عیسیٰؑ کا علم حقائق سے محروم ہونا لازم آتا مگر یہ تو ہر گز نہیں۔ پس عیسیٰؑ نے کہا{ مگر جس کا تو نے حکم دیا} تُو ہی میری زبان سے گویا ہے اور تُو ہی میری زبان ہے۔

آپ جو کہتے ہیں کہہ دیتا ہوں میں نہ زندہ ہوں نہ مردہ ہوں

[أَنِ اعْبُدُوا اللّٰـهَ،(یعنی)اللہ کی عبادت کرو،(المائدۃ:۱۱۷)]۔ذرا اس روحانی خدائی خبر دہی کو دیکھو۔ کیا لطیف ہے اور دقیق و باریک ہے، کہ اللہ ہی کی عبادت کرو۔ دیکھو! جناب عیسیٰؑ نے اسم "اللہ" کا ذکر کیا کیوں کہ بندگانِ خدا کی عبادتیں جدا ہیں، شرائع جدا ہیں۔ (وہ) خاص خاص اسما کو نہیں لائے بلکہ (صرف) لفظ "اللہ" کہا جو تمام اسما کو جامع ہے۔

پھر کہا، رَبِّي وَرَبَّكُمْ، (یعنی) جو میرا بھی رب ہے اور تمھارا بھی،(المائدۃ:۱۱۷)۔ ظاہر ہے کہ اللہ کی نسبتِ ربوبیت ہر ایک موجود سے غیر ہے اُس نسبت سے جو دوسرے موجود سے ہے۔ اسی لیے اپنے قول {رَبِّي وَرَبَّكُمْ} سے ضمیر متکلم و ضمیر مخاطب کی طرف اضافت کرکے ربوبیت کی تفصیل کی۔ مگر تو نے مجھ کو جس کا حکم دیا (کہہ کر) خود کو مامور ثابت کیا۔ مامور تو وہی ہوتا ہے جو عبد ہو، بندہ ہو۔ کیوں کہ امر اسی کو کیا جاتا ہے جس کا فرض ہے فرماں برداری۔ گو وہ فرماں برداری نہ کرے۔

چوں کہ امر بحسبِ مراتب نازل ہوتا ہے لہٰذا ہر ایک کسی مرتبے میں ہونے والا اس مرتبے کے لائق اثر سے رنگین و متاثر ہو جاتا ہے۔ مرتبۂ مامور کے لیے ایک حکم ہے جو مامور پر واقع ہوتا ہے، اور آمر کے لیے ایک حکم ہے، جو ہر آمر میں نمایاں ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ فرماتا ہے، أَقِيمُوا الصَّلَاةَ، (یعنی) نماز پڑھو،(البقرۃ:۴۳ اور کئی آیات میں)۔ لہٰذا وہ آمر و مکلَف ہے اور بندہ مکلِف و مامور ہے۔ بندہ کہتا ہے، ربِّ اغفرلی، (یعنی) پروردگار مجھے بخش دے۔ اس وقت بندہ آمر ہے اور حق مامور۔ حق تعالیٰ بندے سے بذریعۂ امر جو کچھ طلب کرتا ہے وہی بندہ بھی حق تعالیٰ سے بذریعۂ امر طلب کرتا ہے۔ لہٰذا ہر دعا مستجاب ہے، مقبول ہے، اگرچہ حصولِ مقصود میں تاخیر ہو۔ جس طرح کہ وہ شخص مکلِف جس کو نماز پڑھنے کا امر کیا گیا ہو کبھی تاخیر کر جاتا ہے۔ نماز وقت پر نہیں پڑھتا بلکہ امتثال امر میں تاخیر کرتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو دوسرے وقت نماز پڑھتا ہے۔ امر کو قبول کرنا تو ضروری ہے، گو ارادے سے صحیح امتثال امر کا قصد ہی ہو۔

(سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۷ میں آگے) جناب عیسیٰؑ نے کہا، وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ، (یعنی) میں ان پر نگران تھا جب تک ان میں موجود تھا۔ جس طرح پہلے رَبِّي وَرَبَّكُمْ کہا اس طرح یہاں علیؑ و علیہم نہ کہا، کیوں کہ عیسیٰؑ کا نگران خدا تھا اور اپنی امت کے نگران حضرت عیسیٰ تھے۔ یہی حال تمام انبیا کا ہے کہ جب تک رہتے ہیں اپنی امت کے نگران رہتے ہیں۔۔۔ (پھر عیسیٰؑ فرماتے ہیں) فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ، (یعنی) جب تو نے مجھے لے لیا، اپنی طرف مجھے اٹھا لیا، امّت کو مجھ سے چھپا لیا اور مجھ کو ان سے چھپا لیا، تو تُو {بلا توسط میرے، اور بغیر میرے جسم و مادّے کے، روحانی و جسمانی، بلکہ ان کے مادّوں میں، ان کی قوتوں میں} ان پر رقیب و نگہبان تھا۔ کیوں کہ تو ہی ان کی بصارت تھا اور آنکھ تھا، جس کا تقاضا ہے کہ مراقبہ کرے، مشاہدہ کرے اور دیکھے۔

جب سب میں سے وہی دیکھنے والا ہے تو گویا انسان کا خود کو دیکھنا بھی حق تعالیٰ کا انسان کو دیکھنا ہے۔ عیسیٰؑ حق تعالیٰ کے لیے اسم ("الرّقیب") لائے اور اپنے لیے لفظ "شہید"۔ وہ چاہتے ہیں (کہ) اپنے میں اور اپنے رب میں فرق و امتیاز کریں۔ سب کو معلوم ہو جائے کہ عیسیٰ، عیسیٰؑ ہیں بلحاظ بندہ ہونے کے اور حق تعالیٰ حق ہے باعتبار رب ہونے کے۔ اسی لیے اپنے لیے لفظ شہید کہا اور حق تعالیٰ کے لیے اسم الرّقیب۔

پھر قوم کو اپنے شہید ہونے سے پہلے بیان کیا۔ چناں چہ انھوں نے کہا، وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ، جناب عیسیٰؑ کا شہید و نگران ہونا اپنی امّت کے لیے خاص ہے اور ان ہی پر منحصر ہے۔ آپ نے اپنی قوم کو پہلے رکھ کر ایثار بھی فرمایا ہے، اور رعایت و ادب بھی ملحوظ رکھی ہے۔ اس لیے کہ کلام، حق جل جلالہ سے ہو رہا ہے۔ اس سے مخاطبت میں خود پر اہمیت نہ دینی چاہیے۔ اللہ کے لیے رقیب کا اسم لایا تو وہاں علیہم کو رقیب پر مقدم نہ کیا۔ کیوں کہ حق ربّ جلالہ ہر طرح قابل اہتمام ہے۔ اس کے رتبے کا مقدم ہونا باعث ہوا ہے کہ بیان میں بھی اسی کا نام مقدم رہے۔

واضح ہو کہ جنابِ عیسیٰؑ نے اللہ کے لیے اسم رقیب ذکر کیا اور خود کے لیے لفظ شہید لایا یعنی اپنے قول "عَلَيْهِمْ شَهِيدًا "میں (آگے) یہ بھی کہا، وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (یعنی) تُو ہر شئے کا مشاہدہ کرنے والا ہے، (المائدہ:۱۱۷)۔ مگر دیکھو! اس قول میں لفظ "كُلِّ" ہے جو عموم کا فائدہ دیتا ہے اور "شَيْءٍ" بھی ہے جو سخت نکرہ اور غیر معیّن ہے۔ پھر اس کے بعد اسم "شَهِيدٌ" لایا۔ پس حق تعالیٰ ہر مشہود پر شہید ہے، ہر دیدہ کا بینا ہے، ہر مرئی کا رائی ہے۔ مگر اس مشہود کی حقیقت کے اقتضا کے موافق۔

اس قول میں حضرت عیسیٰؑ نے ایک اشارہ کیا ہے کہ جب عیسیٰؑ قوم میں موجود تھے اور اس کے نگران تھے، اس حال میں بھی اللہ تعالیٰ ہی شاہد و نگران تھا۔ شیخؒ کہتے ہیں کہ یہ، تمام اشیا کو، چشم عیسیٰؑ کے اور مادۂ عیسوی کے ضمن میں حق کی نگرانی و شہود ہے۔ اس طرح ثابت ہو گیا ہے کہ حق تعالیٰ بندے کی زبان اور سماعت و بصارت ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد (سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۱۸ کے مطابق) جناب عیسیٰؑ نے ایک کلمہ کہا جو عیسوی بھی ہے اور محمدی بھی۔ کلمۂ عیسوی اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اللہ میں فرمایا کہ یہ قولِ عیسیٰ ہے۔ محمدی اس لیے کہ دعاے مغفرتِ امّت میں حضرت محمد حبیب اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر صرف اسی کی تکرار کرتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی۔ وہ کلمہ یا دعا یہ ہے، إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ، (یعنی) {اے رب} اگر تو ان کو {یعنی میری امّت کو} عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کی مغفرت کر دے تو تُو عزت والا، حکمت والا ہے۔ ذرا اس آیت پر غور کرو "إِن تُعَذِّبْهُمْ" میں "هم" ضمیر غائب ہے،

جیسے ھو ضمیر غائب ہے، یعنی ھو ضمیر واحد مذکر غائب ہے اور ھم جمع مذکر غائب ہے۔ جیسے ،ھم الذین کفروا (یعنی) یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کفر کیا، حق پوشی کی۔ ضمیر غائب سے اشارہ ہے کہ ان کی غَیبت ان کا بُعدِ خیالی ہے۔ ان کی غفلت جو حق تعالیٰ پر مشہود ہے، جو حاضر ہے، پردہ بن گئی، حجاب بن گئی۔۔۔ پھر کہا، إِن تُعَذِّبْهُمْ ضمیر غائب کے ساتھ۔ یہ غَیبت، یہ غفلت ہی تو ان میں اور حق تعالیٰ میں حجاب ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بزبان عیسیٰؑ فرمایا۔ وہ امتِ عیسیٰ کے حضور حق تعالیٰ میں حاضر ہونا پہلے ہے۔ جب حاضر ہوں گے تو کیا ہو گا وہی، كَلَّا إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ،(یعنی) ہر گز نہیں، یہ {غافلین، کافرین} اپنے رب سے اس دن {یعنی قیامت میں} محجوب ہیں،(المطففین:۱۵)۔ کیوں کہ (یہ کفار) مشاہدہ کرنے والے نہیں ہیں اور ان کی غفلت کا خمیر، ان کے ابدان کے آٹے میں (یعنی ان کے جسموں میں) خوب اُٹھ گیا ہے۔ اب خمیر ہی خمیر ہو گیا ہے۔ غفلت ہی غفلت رہ گئی ہے۔ جو غفلت پہلے تھی وہ اب بھی رہے گی۔۔۔ وَمَن كَانَ فِي هَـٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (یعنی) اور جو یہاں کا اندھا وہ وہاں کا بھی اندھا،(الاسراء:۷۲)۔

فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ، کاف ضمیر واحد مذکر مخاطب میں اشارہ ہے، اُس توحید کی طرف جس کی تعلیم عیسیٰؑ نے دی اور جس پر وہ ان کے زمانے میں تھے۔ عِبَادُكَ میں اشارہ ہے کہ بندگی سے زیادہ کیا ذلت ہو گی۔ اس لیے کہ بندے کو خود اپنے پر کسی قسم کے تصرف کرنے کا حق نہیں۔ وہ تو اپنے آقا، اپنے سید کے تحتِ حکم (اور) زیر فرمان رہتے ہیں۔ ان کا آقا بھی ایک، جس کا کوئی شریک نہیں۔ کیوں کہ کہا عِبَادُكَ، ضمیر خطاب کو واحد لا کر۔۔۔ عذاب سے مراد مقصود ذلال (یعنی) ذلیل و خوار کرنا ہے۔ اب اس سے زیادہ کون ذلیل ہو گا جو بندے ہیں۔ ان ذوات کا اقتضا بتا رہا ہے کہ وہ ذلیل ہی ہیں۔ مالک تُو انھیں ذلیل نہ کر کیوں کہ ان کی ذات بندگی سے زیادہ اور کیا ذلّت دے سکتا ہے۔

وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ، اگر تُو ان کو دامنِ رحمت میں چھپا لے اور اس عذاب سے کہ تیری مخالفت کر کے اس کے مستحق ہوئے ہیں، بچا لے۔ عربی میں غفر کے معنیٰ ہیں چھپانا۔ مغفر "خود" (یعنی لوہے کی وہ ٹوپی جو لڑائی کے وقت سر پر پہنی جاتی ہے) کو کہتے ہیں جو سر کو چھپاتا ہے۔

شیخ (ابن عربیؒ) کہتے ہیں، تُو ان کے لیے عذاب سے پردہ (اور) سپر بنا دے کہ ان کا ستر کرے۔ عذاب کو ان سے روکے۔ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ، بے شک تو عزت مند ہے، تیرا احاطہ محفوظ ہے۔ اسم منتقم وقہار سے بچا۔ اللہ تعالیٰ جب کبھی بندے کو یہ نام دیتا ہے تو حق تعالیٰ معز اور بندہ جس کو یہ نام دیا گیا عزیز کہلاتا ہے اور بندۂ عزیز کا سبزہ زار۔ اس کا احاطہ منتقم ومعذّب یعنی انتقام وعذاب دینے والے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی

أَنتَ میں ضمیر فصل و عماد ہے تاکہ بیان میں تاکید اور آیت ایک سیاق، اور ایک رنگ پر ہو جائے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہے،إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ اور كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ، اسی لیےفَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ فرمایا۔ پس کلمہ ،إِن تُعَذِّبْهُمْ، گویا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے امت کی بخشش کے لیے سوال ہے۔ حضورؐ، دربار الٰہی میں رات بھر طلوع فجر تک اس سوال کو بغرض اجابت تکرار فرماتے رہے۔ پہلی ہی دفعہ کے سوال پر اجابت و قبولیت کا فرمان سماعت فرمالیتے تو تکرارِ سوال نہ فرماتے۔ بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ تفصیلی طور سے ایک ایک امّتی کو ان کے ایک ایک گناہ کو حضورؐ کے سامنے پیش کرتا جاتا تھا اور حضورؐ عرض کرتے جاتے تھے، إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ،(المائدۃ:۱۱۸)۔ اگر نبی رؤف رحیم امّت کے عرض و پیش کرنے میں کوئی ایسی چیز ملاحظہ فرماتے جس میں جانبِ حق تعالیٰ کی تقدیم (یعنی) اس کے احکام کی ترجیح کی ضرورت ہوتی تو ان کے لیے دعا نہ کرتے، بلکہ بد دعا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے حالات پیش کیے جو اس آیت کے مقتضیٰ کے مطابق تھے۔ یعنی امّت کے کاموں کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کریں اور اس کے ساتھ عفو کی درخواست کریں۔۔۔ یہ بھی آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو دعا کرتے وقت بندے کی آواز اچھی معلوم ہوتی ہے، تو (وہ) اس کی دعا کی اجابت و قبولیت میں تاخیر فرماتا ہے تاکہ بار بار دعا کرے۔ یہ بھی اس کی محبت کا تقاضا ہے، نہ کہ اعراض و بے توجہی ہے۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ اسم "حکیم" لایا ہے۔ حکیم کے معنیٰ ہیں ہر شئے کو اس کے محل پر رکھنے والا اور اشیا کے حقائق وصفات کے اقتضا سے عدول و تجاوز نہ کرنے والا۔ غرض یہ کہ حکیم وہ ہے جو ترتیب سے واقف اور اس کا علم رکھے۔

حضورؐ اس آیت کی تکرار اور اعادے میں علم عظیم رکھتے تھے۔ جو اس آیت کو پڑھنا چاہے تو اسی طرح پڑھے جس طرح حضورؐ پڑھتے تھے، ورنہ سکوت ہی بہتر ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کسی امر کے کہنے اور دعا کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے تو اس کو قبول بھی فرماتا ہے۔ اور اس کی حاجت کو پوری بھی فرماتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جس دعا کی توفیق دی گئی ہے تو اس کے لیے جلدی نہ کرے (اور) نہ اس کو دیر انگیز سمجھے۔ ہر حال میں جس طرح حضورؐ نے اس آیت پر مواظبت و مداومت (یعنی مستعدی اور مستقل مزاجی) کی تھی خود کرے، یہاں تک کہ اپنے ظاہری کان سے یا باطنی سماعت سے سن لے۔ جیسا تم چاہتے ہو یا جیسا اللہ نے چاہا۔ اگر (اللہ) تمھارے زبانی سوال کا معاوضہ دے گا تو تم کو تمھارے کان سے سنادے گا، اور اگر باطنی طور سے معاوضہ دینا چاہے تو تم کو تمھاری باطنی سماعت سے سنادے گا۔